رقصاں

شکیل احمد شیخ

رقصاں

شکیل احمد شیخ

نام ________ شکیل احمد شیخ
نام کتاب ________ رقصاں
تعداد ________ ایک ہزار
مطبع ___ طیّب اقبال پرنٹرز ، ۷ ابی رائل پارک لاہور
ضخامت ________ ۸۰ صفحات
قیمت ________ ۵۰ روپے


بسم الله الرحمن الرحيم

آنکھوں کے سمندر میں رقصاں کئی طوفاں تھے
اِک لہر گرا دیتا سرکار دہل جاتے

اِنتساب

اپنے دوست

عبدالرحمٰن

کے نام

جو اس مُعاشرہ کے سٹیج پر ایک اچھوتا کردار ہے۔

جھنگ جیسے زرخیز خطے پر شکیل احمد شیخ کا ایک نئے لہجے کے ساتھ وارد ہونا اور یوں دبے پاؤں صاحبِ کتاب بن جانا واقعی اہلِ فن کے لیے حیرت انگیز بات ہے۔

اگر غیر جانبدار ہو کر سوچا جائے تو دریائے چناب کی رومان پرور لہروں کا فیض ہے کہ اس کے کنارے بسنے والوں کے دلوں میں آتشِ عشق ازل سے ہی روشن ہے۔ گو جھنگ جیسی سرزمین سے بطورِ شاعر ابھرنا آسان بات ہے، مگر جہاں سے مجید امجد۔ جعفر طاہر۔ شیر افضل جعفری اور شاد گیلانی جیسے شاعروں نے اپنے فہم و ادراک کی دھاک چار دانگ عالم پر بٹھا دی ہو وہاں کسی نئی آواز کا منفرد اور ممتاز ہونا کسی معجزہ سے کم نہیں۔ پھر بھی نہ جانے وقت کے سمندر کی لمحہ لمحہ مچلتی موجیں کب موتی ساحل پر اُگل دیں۔

شکیل احمد شیخ بساطِ ادب پر نمودار ضرور ہے اور اس کا لہجہ ابھی اس شفاف آئینے کی طرح منعکس ہے جو کسی بھی چیز کے خد و خال کو اسی انداز میں اجاگر کرتا ہے جیسے وہ ہوں اسی طرح شکیل کے احساس کا المیہ اور طربیہ دونوں کا انداز الگ ہے۔ اس کے احساس اور اظہار میں پختہ تجربوں کا قدرے فقدان سہی مگر ہر بات کو کھرا اور سچا کہہ دینا بھی اس کے اسلوب کو نمایاں کرتا ہے۔

کسی بھی نوجوان کا اس دورِ بے ثبات سے نبرد آزما ہونے کے لیے فکری جنگ میں شامل ہو کر انسانی روحوں کے زخم رفو کرنا اور ان کے سچے جذبوں کی مہکار دنیا کو بانٹنا بھی عبادت کے مترادف ہے۔ اس کا انداز اس قدر جدت کا حامل بھی نہیں مگر کئی جگہوں پر اُس نے نئے تجربے بھی کر ڈالے ہیں، کچھ ڈرتے ڈرتے اور کچھ بے باکی سے، وہ "رقصاں" میں اکثر محلوں اور گھروندوں کے تفاوت پر ماتم کناں نظر آتا ہے ؎

اپنا تو نشیمن ہیں یہ مٹی کے گھروندے!
پر اُن کی کہاں اجڑے دیاروں پہ نظر ہے

کہیں وہ دولت کے بار تلے دبتی دل کی دھڑکنوں کی چیخ سُن کر بے تابانہ بے کسی کے اندھیروں میں مشعل سر لیے رواں دواں نظر آتا ہے۔ پھر جب انجانی راہوں کا بے سُود سفر اور ٹوٹتی رُوح کی دہلیز پر خود کو بے اثر محسوس کرتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ؎

یوں تو صیّاد کے ہر تیر کو ہنس ہنس کے سہا
اُس مسیحا نے ستم ڈھائے تو دل ٹوٹ گیا

اس دَورِ ابتلا کے کرب کو شکیل احمد شیخ کی جواں بصیرت نے کتنی کمال خوبی سے حیطۂ تحریر میں سمیٹا ہے کہ بآسانی قاری اس کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے زمانے کے رویّوں کے ساتھ ساتھ انسانی قدروں کی پامالی نے تقریباً ہر ذی شعور شخص کو متاثر کیا ہے۔ مگر شاعر انسانی طبقے کا حسّاس ترین فرد ہوتا ہے اور وہ اپنی قوتِ متخیّلہ سے ہر چیز کو اس روپ میں دیکھنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ ہر وقت بے قرار اور مضطرب رہتا ہے۔ جب اس کے سہانے خواب دُنیا کی بارونق گلیوں سے اپنی زخمی انگلیوں سے تعبیریں ٹٹولتے ہوئے شامل ہو جاتے ہیں تو وہ باہر کے ماحول سے گھبرا کر حصارِ ذات میں پناہیں ڈھونڈتا ہے مگر جب بھی اس کے درِ احساس پر کوئی سانحہ دستک دیتا ہے تو اس کے ادراک میں کھلبلی مچ جاتی ہے تو وہ یُوں اپنے جذبوں کا اظہار کرتا ہے ؎

کتنی امید سے یہ دَرد چلے آتے ہیں!
غم کا سامان لیے میرے دریچے کی طرف
شام ہوتے ہی ویرانی کیوں سمٹ آتی ہے
ایک پیمان لیے میرے دریچے کی طرف

ادب کے بدلتے ہوئے رویّوں نے مختلف اصنافِ سخن کو جنم دیا مگر غزل ہر دَور میں ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے ہر دلعزیز رہی ہے اور اب جبکہ غزل گل و بلبل سے نکل کر گھر اور دفتر تک آ پہنچی ہے تو ایسے میں تغزل کو برقرار رکھنا بہت ہی دشوار ہے کیونکہ یہ وہ خاص کیفیت ہے جو غزل کو زود اثر بناتی ہے جبکہ شکیل کے ہاں جہاں قدیم طرزِ غزل کی بو باس موجود ہے۔ وہاں اس کی شاخِ اظہار پر کئی نئی کونپلیں بھی دکھائی دیتی ہیں جیسے وہ کہتا ہے ؎

دھول میں گم ہو گیا وہ دھوپ میں چلتا ہُوا
ایک سایہ رہ گیا دیوار پہ ڈھلتا ہُوا

کہیں تو وہ کھُلے اور صاف الفاظ میں اپنے ارمانوں کا نوحہ خواں بن جاتا ہے اور کہیں کہیں علامت کے لبادے میں دَبے لفظوں میں اپنے رنج و غم کا اظہار کر لیتا ہے لیکن یہاں وہ کس اچھوتے انداز میں اپنے اشکِ رائیگاں کی کم مائی اور جاودانی پر یُوں کہہ اٹھتا ہے

؎ وہیں وہیں سے امنگوں کی گرد اٹھتی ہے
جہاں جہاں میرے آنسو گرائے جاتے ہیں

مگر کہیں کہیں اس کا احساس غمِ کائنات سے گریز پا ہو کر غمِ جاناں کی طرف لوٹتا نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں جس کی چبھن اس کے پورے مجموعۂ کلام میں کہیں ہلکی اور کہیں تیز طور پر محسوس کی جاسکتی ہے کیونکہ نوعمری کی شاعری مضرابِ غم سے سازِ دل کے تاروں سے پھوٹتی ہے۔ اور اپنے اندر ندرت رکھتی ہے۔ اور اسی کا اظہار اس کے ہونٹوں پر یوں مچلتا ہے

؎ کسی کے لب پہ کوئی داستاں مچلتی ہے
وہ اپنے ناز میں گم ہیں لجائے بیٹھے ہیں۔

لیکن انسانی زندگی میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں غمِ جاناں کی تلخیوں میں غمِ ایام کی کسک بھی در آتی ہے۔ انسانی احساس کا آئینہ جس قدر شفاف ہو گا اسی قدر اس کے جذب تخیل اور تجربے کی تصویر واضح ابھرے گی۔ جبکہ عہدِ حاضر نے انسانی قدروں اور اشیاء پر اس قدر منافقت اور ریاء کی ملمع کاری کر دی ہے کہ ان کے اصلی خدوخال دھندلا کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم کرنا سخت مشکل ہے۔ پھر بھی شکیل کے خیالات کی کمان سے نکلے ہوئے اشعار کے تیر اگر نشانے پر نہیں تو کہیں کہیں اس کے قریب ضرور جا لگے ہیں ؎

جانے کیوں یاد کے دریچوں سے
ایک دستک سنائی دیتی ہے
درد کے اک نئے ملاپ کے ساتھ
غم کی صورت دکھائی دیتی ہے

یہ بات بھی بجا ہے کہ شاعر معاشرے کی آنکھ اور اپنے ماحول کا بہترین نباض ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے ماحول کے چہرے پر ابھرنے والی خفیف سی جھریوں کو بھی بڑی ژرف بینی سے دیکھ کر اپنے احساس میں سلوٹوں کی صورت ان کو محسوس کرتا ہے اور شاید یہ بھی اس دور کی گھٹن اور بے ثباتی کا نتیجہ ہے کہ شکیل جیسا شاعر جو زلفِ یار میں جوانی کی پناہیں ڈھونڈتا ہے اور آنچل کی ہوا سے تسکینِ قلب کا سامان کرتا ہے اس کا یوں فردوسِ حسن سے نکل کر مقتل میں آ جانا بڑی عجیب بات ہے۔ لیکن یہاں بھی اس کے ارمانوں کی شکستگی کی صد گونہ بختی نظر آتی ہے ؎

جلتے گئے دیپک سرِ مقتل میری خاطر
آمادہ مرے قتل پہ وہ شوخ مگر ہے

شکیل اس ادب کے صحرا کی وادی میں اجنبی راستوں پر اپنی آبلہ پائی سمیت

آنکلا ہے ۔ دیکھئے اب منزلِ ادب کے ہمسفر اس سے کس حد تک متاثر ہوتے ہیں یا وہ کہاں تک اپنے آبلوں سے مسافتوں کے سینے پر داستانِ دل لکھنے میں کامیاب ہوتا ہے جبکہ وہ خود کو اس صورتِ حال کے لیے پہلے سے تیار کیے ہوئے ہے۔

اک آپ کے دیدار کو پانے کی طلب میں
سلطان بھی خیرات کی چکی میں پسے ہیں

ظفر سعید
جنرل سیکرٹری
بزمِ افکارِ نو جھنگ

خلّاق کی تقدیر کی شفقت نے ہمیشہ
گرداب میں خود آکے مجھے تھام لیا ہے
اس اسم میں پوشیدہ ہیں کونین کے گوہر
ہر حال میں مَیں نے یہی نام لیا ہے

ویران دریچوں کو بے تاب اگر جانو
سائل کو بھی عسرت کا اک اُجڑا نگر جانو

ہم دُور نہیں بستے ہیں دل کے مکینوں میں
گر نظر کی زحمت کو نہ لمبا سفر جانو

اَب دل کو نہ تڑپاؤ وہ جا بھی چکے کب سے
اے بادِ صبا سمجھو، جھونکے کا گذر جانو

موجوں کے تھپیڑے ہیں یا وقت کی طغیانی
اس دَرد کے چکر کو قسمت کا بھنور جانو

یہ ناطے شکیلؔ ان کو مٹی کے نِشاں سمجھو
اس دَور میں چاہت کا انجام مگر جانو

☆

تمہاری آنکھ سے گہرا کہاں یہ ساگر ہے
مجھے ڈبوئے ذرا ڈوبتا جہاں گر ہے

زہے نصیب مقدر میرا ہیں ویرانے
یہی تھا اپنا نشیمن یہی مرا گھر ہے

یہاں تھیں جتنی خزائیں وہ اپنے ساتھ چلیں
فسردہ کیوں ہیں عنادل عجیب سا ڈر ہے

غمِ حیات کا گرداب بھی انوکھا ہے
جسے ہی ڈوبتا سمجھے وہی شناور ہے

جھکی ہے شاخِ تمنا شکیل انہی کے طفیل
عدو پہ بحرِ عنایت تبھی تناور ہے

☆

دھوپ میں گم ہو گیا وہ دھوپ میں چلتا ہُوا
ایک سایہ رہ گیا دیوار پہ ڈھلتا ہُوا

ظلمتوں کے پیرہن میں سوزح اٹک رہ گئی
کوئی دیپک بجھ گیا برسات میں جلتا ہُوا

اِک دریچہ کب سے ہے رقصاں کسی کی یاد میں
شہرِ ویراں کے خس و خاشاک کو کھلتا ہُوا

ریگزاروں کی جھلستی آگ میں کیوں جا بسا
آس کے پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں پلتا ہوا

برگِ باراں کی طرح ہم سے شناسائی تھی
دشتِ ویراں میں مجھے چھوڑ کے جانے والے

کرچیاں ہم نے ہیں پلکوں سے چُنی حسرت کی
محفلِ عیش میں دِل توڑ کے جانے والے

کیا بھلا رُوٹھ کے آئیں گے ترے کوُچے میں
زِندگانی سے بھی مُنہ موڑ کے جانے والے

ہجر کی آگ میں جلتے ہیں ہمیشہ دونوں
پھُول صحراؤں میں یُوں چھوڑ کے جانے والے

کِتنا اِترائے میرے قتل پہ وہ آج شکیلؔ
سُرخ آنچل وہ کہیں اوڑھ کے جانے والے

☆

لہو میرا ہو یا رنگِ حنا یُوں پیار سے چھیڑو
کہ اِن سفّاک ہاتھوں پر گلوں جیسا نکھار آئے

سُنا جو چاند بھی اُن سے مبارز حسن طلبی ہے
ہم اُن کو دیکھنے کے شوق کو دیوانہ وار آئے

عجب صیّاد دیکھا ہے فقط پھندا تبسّم کا
مگر اس جال میں پھنسنے کو اُڑ کے خود شکار آئے

مرے ذوقِ لطافت کا انہیں کتنا خیال آیا
سرِ مقتل بھی وہ یُوں عنبریں گیسو سنوار آئے

وہ جس رہزن نے لُوٹی ہیں مرے ہی پیار کی خوشیاں
اُسی کو دیکھتے ہی بے تحاشا مجھ کو پیار آئے

شکیلؔ اِک بار اپنی وحشتوں پہ مُسکرا دینا
چمن کی رونقوں میں جب کوئی رنگیں بہار آئے

☆

ہر موڑ پہ حالات کی چکی میں پسے ہیں
آنسو میرے برسات کی چکی میں پسے ہیں

اِک آپ کے دیدار کو پانے کی طلب میں
سلطان بھی خیرات کی چکی میں پسے ہیں

وہ دِن کو جلاتے رہے اِس حسُن کے دیپک
اور ہم ہیں کہ اک رات کی چکی میں پسے ہیں

اِس پیار کی دیوی کے تقدّس کی قسم ہم
نازاں ہیں کہ اُس ذات کی چکی میں پسے ہیں

کِس طرح بتائیں وہ شکیلؔ اپنی کہانی
جو ٹوٹتے جذبات کی چکی میں پسے ہیں

میں تو تنہائیوں کا باسی ہوں
میری دُنیا سے دُور ہو جاؤ
لے کے ہاتھوں میں پیار کی مشعل
تم سرِ راہ نُور ہو جاؤ

★

سازِ ونجلی ہے تو اک تان ہیں ڈھلتے سائے
کچھ اندھیروں کا حسیں مان ہیں ڈھلتے سائے

اُن کے دامن میں پناہ پاتی ہے بے رحم چمک
کتنے پُر درد ہیں ماہان ہیں ڈھلتے سائے

کِس کی آغوش میں سو جاتا ہے تھک کر سورج
اِن اُجالوں کی یہی جان ہیں ڈھلتے سائے

جو چکوری ہے لیے دِل میں ہزاروں ارماں
اُس کے بھی وصل کا سامان ہیں ڈھلتے سائے

بہتی آنکھوں کی قسم اشک فشانی ان سے
رقص و محفل کی بھی یہ شان ہیں ڈھلتے سائے

بند کروں کوزے میں دریا کو تو دو حرف شکیلؔ
میرے ہی درد کا عنوان ہیں ڈھلتے سائے

غمِ ہجراں کے پیام آئے تو دِل ٹوٹ گیا
ان کے غیروں کو سلام آئے تو دِل ٹوٹ گیا

یُوں تو صیّاد کے ہر تیر کو ہنس ہنس کے سہا
اِک مسیحا نے سِتم ڈھائے تو دل ٹوٹ گیا

کِسی بیگانے کی ٹھوکر کی شکایت کیسی؟
یاد اپنوں کے کرم آئے تو دِل ٹوٹ گیا

وہ جو دھرتی پہ حقیقت کے حسیں داعی تھے
آج محسوس ہوئے سائے تو دِل ٹوٹ گیا

جو کبھی زینتِ محفل تھے وہی شخص شکیلؔ
آج مِلنے سے بھی گھبرائے تو دل ٹوٹ گیا

بے وفائی ہی ایک طعنہ ہے
بے وفا صاف بچ نکلتے ہیں!
کب منجّم ہے صدق سے واقف
ہاں کئی جھوٹ سچ نکلتے ہیں

تقدیر کے روندے کو ملے کیسے دلاسا
شبنم کے بنا جگر ہے لالے کا پیاسا

ہے کھوئی ہوئی آنکھوں میں کیا اس کے سوا اور
کچھ ڈوبتے تارے ہیں یا اک ٹوٹتی آشا

اِس فخر سے کلیوں سے بھی آنکھیں میں چُرا دُوں
گر مجھ کو ملے آپ کا دیدار ذرا سا

بندھن نہ بنے طالب و مطلوب میں یونہی
وہ ہم سے شناسا رہے ہم اُن سے شناسا

جیتے ہیں شکیل ایک دلاسے کے سہارے
تڑپاتی مجھے آس ہنساتی ہے نراشا

★

غنچے بھی کسی شہ پر اٹھکیلیاں کرتے ہیں
الزام تباہی کا وہ مجھ پہ ہی دھرتے ہیں

وہ غیر کے ہو بھی چکے بس دِل کی تسلّی پر
نادان ہیں ہم کتنے دم اس کا ہی بھرتے ہیں

کلیوں سے کہیں نازک پھولوں سے کہیں خوش رنگ
اور اس پہ نزاکت یہ ملنے سے بھی ڈرتے ہیں

کچھ حال کبھی پوچھا ہے ان اپنے دیوانوں کا
جو تیری جُدائی میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

گھبراتے ہو کیوں ان سے یہ اشک ہیں وہ موتی
جن شبنمی قطروں سے یہ چہرے نکھرتے ہیں

☆

جو سمے خزاں کے گذرے تمہیں کیسے میں بتاؤں
کہیں خار چنتے چنتے اے بہار مر نہ جاؤں

اب کاش تو بھی تڑپے مرے پیار کی تڑپ سے
تیرا دل بھی مجھ پہ آئے تجھے میں بھی کچھ سناؤں

میرے پیار کی حقیقت کو وہ دل سے مان جائیں
انہیں بھول جائے سب کچھ کوئی زخم گر دکھاؤں

میری حسرتوں کے قصے سرِ لب مچل رہے ہیں
یہاں کون راز داں ہے کِسے داستاں سناؤں

اِس درد کا مداوا ڈھونڈو شکیل ایسا
پھولوں سے جو ملے ہیں وہ زخم میں بھلاؤں

حنا کے رنگ بھی حزن و ملال رکھتے ہیں
کسی کے خون سے مانگ کا جمال رکھتے ہیں
چھپا کے خود کو مگر ہاتھ کی لکیروں میں!
دبی زباں سے ہزاروں سوال رکھتے ہیں

★

اَب کہیں نام نہیں دَرد کا سُر تانوں میں
سوز کی مَے بھی میسّر نہیں میخانوں میں

میری ناؤ کا مقدّر بھی ہے تنکے جیسا!
ناخُدا کھوئے ہیں گردابوں میں طوفانوں میں

تیرے انداز کی اک ہلکی جھلک پائی ہے
کئی قصّوں میں کتابوں میں اَور افسانوں میں

کس قدر قحط ہے اِنسان کا اِس دُنیا میں
ڈھُونڈ کے تھک گئے اِنسان ہی اِنسانوں میں

اِک پجاری کی بکھرتی سی تراشا پہ شکیلؔ
آج اَصنام بھی بے چین ہیں بُت خانوں میں

☆

بیتے دنوں کی یاد دلاتی ہیں بجلیاں
افسانے تیرے مجھ کو سناتی ہیں بجلیاں

پہلے تو اُن کو میرے مقدّر سے چھین کر
پھر اپنا آپ مجھ پہ گراتی ہیں بجلیاں

خود ہی کہا کہ بجلی ہُوں میں بادلوں کے سنگ
اب پوچھتے ہیں کیوں تجھے بھاتی ہیں بجلیاں

چپکے سے لے کے ان تیرے ہونٹوں کی تازگی
کیا کیا غضب کے رنگ دکھاتی ہیں بجلیاں

کتنے ہی دل کے پھول بچھے ان کی راہ میں
اور اپنی رہ میں خار بچھاتی ہیں بجلیاں

دے کے شکست من کے سمندر کو آشتی
غم آدمی کے دِل سے بھلاتی ہیں بجلیاں

سُوکھے پتّوں سے پیار کیا مانگیں
خود خزاں ہیں بہار کیا مانگیں
جن کا شیوا ابھی رہزنی ہو شکیلؔ
اُن سے لُٹتا قرار کیا مانگیں

مقدر ہمارے کہاں جا کے سوئے
عجب بحرِ ظلمت میں ملّاح کھوئے

یہ جھرنا نہیں میرے اشکِ رواں ہیں!
جہاں حُسن نے عشق کے داغ دھوئے

وفاؤں کی کونپل سے گل بن کے نکھریں
محبت کے وہ بیج جو ہم نے بوئے

چلے ہیں فضاؤں میں دُنیا بسانے
وہ دامن میں ٹوٹے ستارے سموئے

تشکیلؔ اپنی فِطرت بھی ہے مثلِ شمع
بجھاؤ تو چُپ ہے جلاؤ تو روئے

☆

جلتا ہوں رات دن کہ تیری جستجو ملے
مانگوں جبھی بہار مجھے رنگ و بو ملے

لازم نہیں کہ حسرتِ دل اس جہان میں
جس چیز کو وہ چاہیں وہی ہو بہو ملے

بیزار ہوں صعوبتِ دوراں سے اِس طرح
ٹھکراؤں ساری دُنیا مجھ کو جو تُو ملے

وارا گیا ہوں عالمِ رعنائی میں تو کیا
دیوی کو بھینٹ چاہیئے جس کا لہُو ملے

گھٹتا ہے دم شکیلؔ گھٹن سی فضا میں ہے
یہ راز تب عیاں ہو جو مشک و سبُو ملے

★

سنگِ مَرمَر سے تراشے ہوئے اصنام سے اب
دِل لگانے میں تو خواری کے سوا کچھ بھی نہیں

کِھلتی کلیوں میں، فضاؤں میں، گلستانوں میں
صرف تصویر تمہاری کے سوا کچھ بھی نہیں

مُجھ سے چلّا کے یہ کہتی ہیں مری ریکھائیں
حسرتِ بادِ بہاری کے سوا کچھ بھی نہیں

بحرِ ظُلمات کے بھنوروں میں بھی لہروں کی قسم
ڈوبتی ناؤ ہماری کے سوا کچھ بھی نہیں

ہم جسے سمجھے تھے پیمانِ وفا حرفِ شکیلؔ
محض افسانہ نگاری کے سوا کچھ بھی نہیں

★

چند لڑیاں پروئے بیٹھا ہوں
داغ دامن کے دھوئے بیٹھا ہوں
کل تلک قرب کی تمنّا تھی
آج سوچیں بھی کھوئے بیٹھا ہوں

آکاش کی وسعت ہوں مری شام ہے گوری
ساون کا حسیں رنگ ترے نام ہے گوری

کانٹے کی چبھن محض ہے اوروں کیلئے درد
اک پھول ہی یا منبعٔ آلام ہے گوری

ندرت ہے ترے شہر کے انصاف میں کتنی
اک شخص پہ لُٹ جانے کا الزام ہے گوری

انمول خوشی وصل کی لیکر بھی نہ بیچوں
جو درد ترے واسطے بے دام ہے گوری

جلتی ہوئی شمع کی رفاقت میں یوں جلنا
سرشار پتنگے کا یہی کام ہے گوری

مرنا بھی شکیلؔ اس پہ جو جینے کا سہارا
اس دور میں یہ عشق کا ابہام ہے گوری

بکھری زلفوں سے حسیں رُخ کو چھُپانا کیسا
جھیل سی آنکھوں سے دریا کو بہانا کیسا

جب کہا آپ مرے من میں بسے رہتے ہیں
بولے یہ بات تو پھر روز بلانا کیسا

اِک کرن باقی تھی کھو بیٹھا ہُوں رفتہ رفتہ
اب تو پَو پھٹ بھی چکی دیپ جلانا کیسا

کچے دھاگے سے کوئی ٹھوس توقع کیسی
ریت کے محل میں آنگن کا بسانا کیسا

جس کی ریکھاؤں نے ٹھوکر کو پکارا ہو شکیلؔ
اس کی رہ سے کسی کنکر کا ہٹانا کیسا ؟

تشنگی ایسی سرِ آب پیاسا ہی رہا
جام اَوروں کو ملے مجھ کو دلاسا ہی رہا
وصل کی دُھن میں تڑپتا رہا ہر آن شکیلؔ
صحبتیں مل نہ سکیں اُن سے شناسا ہی رہا

سرِ دار کس نے اُدا چھین لی ہے
دِوانے سے من کی صَدا چھین لی ہے

انہی پارساؤں کی چھوٹی زمیں پر
خُداؤں نے مل کے وفا چھین لی ہے

فریبِ نزاکت کے اِن دائیوں نے
ہری ڈالیوں سے حیا چھین لی ہے

کِسی آشیاں نے زمیں بوس ہو کر
ٹھٹھرتے مکیں سے رِدا چھین لی ہے

تہِ آب پلتے ہوئے موتیوں نے ! !
طوفانوں سے موجِ اُنا چھین لی ہے

لبِ شوخ پر آج شکوہ ہے کیسا ؟
عجب رہزنی ہے جفا چھین لی ہے

★

ہم اہلِ جنوں دیوانوں کو سنسان بسیرے بھاتے ہیں
اِس سُونے نگر کی وحشت سے کچھ افسانے یاد آتے ہیں

ہیں چاک گریباں خاک نشیں اعزاز یہ اُن کے در سے ملا
اور اس پہ قیامت صُورت گر اب پیار کا ڈھونگ رچاتے ہیں

اِس شہر میں کون مسیحا ہے سَب پیار کے رَوگی لگتے ہیں
کچُھ ہجر میں آہیں بھرتے ہیں کچھ زخم اپنے دکھلاتے ہیں

جو پیار کی رمز سے ناواقف جو لفظ وفا سے بیگانے
وہ اہلِ جفا لیکن ہم کو آدابِ وفا سکھلاتے ہیں

بیگانے شکیلؔ بنوا یسے کسی اَور جہاں میں کھو جاؤ
جس طرح شام ڈھلے سائے ویرانوں میں کھو جاتے ہیں،

جانے کیوں یاد کے دریچوں سے
ایک دستک سُنائی دیتی ہے
درد کے اِک نئے ملاپ کے ساتھ
غم کی صُورت دکھائی دیتی ہے

★

بھول سکتا نہیں میں اُن کی سُہانی یادیں
گردشِ وقت کی بے پردہ نشانی یادیں

شوقِ جدت میں تو، ہونگے وہی بے دردمگن
اپنے آنگن میں بسی ہیں وہ پُرانی یادیں

وہ مجھی سے ہیں مرے ہیں وہ میری خاطر ہیں
یوں مرا درد جگاتی ہیں سُہانی یادیں

زندگی پیار کی ہاری ہوئی اک بازی ہے
مجھ کو ہر رات سناتی ہیں کہانی یادیں

غم کے ڈستے ہوئے لمحات میں ہنسنے کیلئے
مجھ کو ہیں آپ کے دامن سے چرانی یادیں

جو چشمِ مَے سے دِل کا جام ٹکرایا نہیں کرتے
نشہ وہ ساغرِ جم کا کبھی پایا نہیں کرتے

مِلے اُن سے مجھے یہ خار اَب خواہش نہیں گُل کی
مجھے یُوں فخر ہے کانٹوں پہ مُرجھایا نہیں کرتے

جنہیں کچھ پاس نہ ہو بے کسوں کے پھیلے دامن کا
وہ اپنے ریشمی آنچل کو لہرایا نہیں کرتے

جو ہوں گے باخبر عشاق کی شعلہ فشانی سے
وہ بڑھ کے تھام تو لیتے ہیں تڑپایا نہیں کرتے

جلے ہوں جو شکیلؔ اِس پیار کی فرقت میں برسوں سے
سُلگتے راستے کی لُو سے گھبرایا نہیں کرتے

★

بھیگی ہوئی آنکھوں سے کچھ اشک پرو لیتا
کانٹے تیری راہوں کے پلکوں میں سمو لیتا

انجامِ محبت سے واقف جو اگر ہوتا!
جو دل میں لہر اٹھتی اِک کانٹا چبھو لیتا

ظلمات کے معبد ہوں راتوں کی سیاہی ہیں
پھر ان کے ہنسانے کو جی بھر کے میں رو لیتا

مِلتی جو مجھے شکتی حق اپنا جتانے کی!
جو غیر کے تھے ہمراہ ساتھ ان کے ہی ہو لیتا

اک یاس میں جاگا ہوں مدت سے شکیلؔ ایسا
اس زلف کے سائے میں دوپہر ہی سو لیتا

مجھ کو پلکوں سے جام ملتے ہیں
کتنے گہرے پیام ملتے ہیں
جب بھی ڈھونڈو خوشی کے قاتل کو
وہی اپنوں کے نام ملتے ہیں

یہی وردِ زباں ہے اب دلِ بیزارِ میخانہ
تصوّر میں بسا ہے جب سے کوئے یارِ میخانہ

فقط مصلوب ہونے کی عنایت اتنے گُل کھلتے
لیے جاتا ہے مجھ کو وجد سوئے دارِ میخانہ

یہی اک پیچ سُلجھانے میں اتنے محو ہیں ساقی
مری سوچوں کا مرکز کیوں بنا ہر بار میخانہ

بنا ہے میکدہ بھی اب مرے سرکار کی صورت
کہیں تو جام نفرت اور کسی کا پیار میخانہ

جہاں پیمان ہوتے ہیں تشکیل اک جام اور لب کے
مئے الفت نبھانے کا حسیں اقرارِ میخانہ

★

ایک عندلیب کسی دار پہ چڑھی جیسے
ہنسا ہے پھول کھلے کوئی پنکھڑی جیسے

گری ہے دل پہ قیامت کے روپ میں بجلی
کسی سے آنکھ ہے سرکار کی لڑی جیسے

عجیب کیف تھا پلکوں سے اشک باری کا
لگی ہو آگ سے برسات میں جھڑی جیسے

کسی کی بزم سے نکلے تو ہم نے یہ سوچا
شباب بیت گیا بن کے اک گھڑی جیسے

مرے نصیب کا الجھاؤ یہ بتاتا ہے!
ہے ان کی زلف کسی پیچ سے اڑی جیسے

☆

یُوں غمِ دشت سے جوڑا ہے مجھے چاہت نے
اِس بھرے شہر میں اِک شخص بھی اپنا نہ مِلا

حسرتِ وصل میں فرقت کی حلاوت بھی گئی
رُوٹھے ہیں مجھ سے تخیّل بھی جو سپنا نہ مِلا

منتظر ہم بھی تھے یُوں تھام ہی لیتے ساقی
کِسی بے چین سہارے کو بہنپنا نہ مِلا

وہی انداز، وہی کرب، وہی شوخ مگر
قصّۂ درد میں مجنوں کا تڑپنا نہ مِلا

کتنے ویراں سے ہیں یہ پیار کے معبد بھی شکیلؔ
رسمِ اُلفت تو رہی عشق کا جپنا نہ مِلا

بیتی یادیں خیال کے قصّے
آدمیّت کی چال کے قصّے
ہر حسیں داستاں سے بڑھ کر ہیں
اُن کے رُخسار و خال کے قصّے

☆

میرا مقسوم مری راحتوں کے درپے تھا
ہے اپنا جرم کسی اور سے گلا بھی نہیں

پھرے ہے خانماں پنچھی کے سنگ ہواؤں میں
وہ رُوحِ بادِ گلستاں ہمیں ملا بھی نہیں

کچھ اس سکوں سے گئے ہیں کسی کی دنیا سے
کہ اُس کی چشمِ عنایت کا در ہلا بھی نہیں

سرِ رقیب تو لطف و کرم کے سائے ہیں
ہماری سمت عنایت کا سلسلہ بھی نہیں

کہیں تو اتنی بہاریں کہ اب ہے بیزاری
شکیلؔ اپنے مقدّر کا گُل کھلا بھی نہیں

☆

جشنِ طرب میں تیرے اے جان ہم نہ ہوں گے
اِن راحتوں میں شاید اب میرے غم نہ ہوں گے

بن جائیں گی بہاریں تیرے چمن کی زینت
برگِ خزاں چلا ہُوں اب پھُول کم نہ ہوں گے

مانا کہ تیری محفل سجتی ہے رونقوں سے!
پر اشک سنگ شمع میرے صنم نہ ہوں گے

رنجش مجھے بھی ہو گی تجھ سے یُوں دُور رہ کر
جب چین کی لہر میں تیرے ستم نہ ہوں گے

ہم کو شکیلؔ بچھڑے دعوے ہے چاہتوں کا
اب حسن و عشق باہم یُوں دم بدم نہ ہوں گے

★

رہنے دے مجھے اپنی ہی پائل کی لڑی میں
عشاق کب اس بھیس میں پہچانے گئے ہیں

اب پاس میرے دل ہے نہ اشکوں کے خزانے
وہ دونوں اسی شوخ کو سمجھانے گئے ہیں

اس طشتِ جگر میں ہیں میرے خون کے چھینٹے
جو حُسن کی سرکار میں نذرانے گئے ہیں

دیکھی نہ سُنی ایسی مگر اپنے ستم گر
ہیں ارض مکیں خلد کو شرمانے گئے ہیں

آیا ہے شکیلؔ ایسا بھی یہ وقت چمن پر
خود پھول ہی بُو باس کو ٹھکرانے گئے ہیں

میٹھے گیتوں کی دھیمی لرزش میں
من کا سنگیت ڈُوب جاتا ہے
دے کے تعظیم اُن کی نِسبت کو
ہر نیا گیت ڈوب جاتا ہے

☆

مہتاب کو شیشے میں اُتاروں گا کئی بار
اِس سوز کو سوچوں سے گزاروں گا کئی بار

میں یادِ بہاراں ہُوں نہ چاہتے ہوئے پھر بھی
اُس شوخ کی زلفوں کو سنواروں گا کئی بار

ان کرب کی سنگلاخ چٹانوں سے گزر کر
آکاش کی رفعت کو پچھاڑوں گا کئی بار

پھر سینچ کے ہر شاخ کو میں اپنے لہُو سے
ان سوکھتے پتوں کو نکھاروں گا کئی بار

ویران کناروں سے میں اُکتا بھی گیا تو
طوفان کو ساحل سے پکاروں گا کئی بار

بھٹکی ہوئی ہر آس کو بے تاب سمجھ کر
گردابِ تمنا سے اُبھاروں گا کئی بار

آپ کی بے رُخی نے مارا ہے،
اب تو یادوں کا ہی سہارا ہے!

جھُومتی وادیوں کو کیا جانیں
مجھُ کو کافی تیرا نظارا ہے

کیف سے رُوح جھُوم اٹھی ہے
اِک مسیحا نے جو پکارا ہے

آج پھر چاند چھُپ گیا یہ بھی
اُن کے آنے کا اِک اشارہ ہَے

دنیا جس کو حسین کہتی ہے
وہ فقط آگ کا شرارا ہَے،

بیتے ہُوئے لمحات کُریدیں تو خبر ہو
جذبات کی مہکار میں کچھ بھُول رہے ہیں
یہ ناز ہے یا شوقِ تماشہ کہ ستم گر
پازیب کی جھنکار میں کچھ بھُول رہے ہیں

☆

یُوں حالِ پریشاں کہ نہ کچھ اپنی خبر ہے
ملبوسِ غمِ دہر میں دکھوں کا نگر ہے

اپنا تو نشیمن ہیں یہ مٹّی کے گھروندے
پر ان کی کہاں اجڑے دیاروں پہ نظر ہے

اِک چوٹ سے کیوں صُورتِ جاناں کو بُھلا دیں
یہ عشق کی راہیں ہیں بڑا لمبا سفر ہے

جلنے لگے دیپک سرِ مقتل مِری خاطر
افسردہ میرے قتل پہ وہ شوخ مگر ہے

میں جب سے تیری زلف کے سائے میں جلا ہُوں
دائم میری جانب خوشبو کا سفر ہے

☆

انسانوں کی نگری میں بھی اِنسان نہیں ہے
گرچہ کوئی بپھرا ہُوا طوفان نہیں ہے

کیوں قمقموں کو دیکھ کر وحشت ہوئی مجھے
آرائشِ محفل ہے یہ زندان نہیں ہے

پہنچی ہیں کہاں ٹوٹے ہُوئے دِل کی صدائیں
کِس حُسن کے دروازے پہ دَرباں نہیں ہے

اعزاز میں اَب کس کے بچھائیں گے ہم آنکھیں
نادار کے کاشانے میں مہمان نہیں ہے

مٹی میں ملے جاتے ہیں سب اشک تمہارے
کیا سُنتا تیری آہوں کو یزداں نہیں ہے

★

مہکتی صبائیں سماں جا کے دیکھو!
وہ پھولوں بھری بستیاں جا کے دیکھو

جلا ہے نشیمن حسیں آرزو کا!
وہیں خاک ہوگی جہاں جا کے دیکھو

یہ درپن کی بے باک پردہ کشائی،
ہے قاتل مرا مہرباں جا کے دیکھو

تڑپنے کی لذّت کی گر جستجو ہو،
جہاں ہم ہیں سجنی وہاں جا کے دیکھو

شکیلؔ آج کھولے ہیں گیسو کسی نے
وہ انداز، وہ مستیاں جا کے دیکھو

مَن کی دنیا کو شانتی دے کر
رنگ و بُو کے جہاں میں کھو جائیں
بھول کر پستیوں کی خاک شکیل
ثروتوں کے نِشاں میں کھو جائیں

☆

ارماں کی چتاؤں میں جلو تم بھی شرارو
دعویٰ ہے رفاقت کا مِرے سنگ سدھارو

بکھرے ہیں کسی جھونکے سے انجانے میں شاید
غنچو میرے محبُوب کے گیسو تو سنوارو

سمجھُوں گا اسی بات کو یارانِ محبّت
بھُولے سے ہی مجھ کو کبھی اِک بار پکارو

کہہ لُوں گا انھی کو ہی محبّت کی بہاریں !
لمحات یہ پت جھڑ کے مِرے ساتھ گذارو

کچھ اور شکیلؔ اپنی کہانی بھی ہو رنگیں ،
کچھ اور بڑھو پلکوں سے ٹوٹے ہوئے تارو

☆

کارواں چھوڑ چلے ساتھ نبھانے والے
یونہی افسانے بناتے ہیں زمانے والے

وقت کی دھول میں گم ہو گئے وہ شعلہ بدن
خانۂ دل میں کئی دیپ جلانے والے

اک زمانہ تو مجھے وصل کی قربت دے کر
پھر جدائی میں مجھے رو کے رلانے والے

کتنا احسان مرے حال پہ جتلاتے ہیں
ایک غم دے کے سبھی درد بھلانے والے

کیوں خفا ہو گئے وہ اپنے ہی پنچھی سے شکیلؔ
پیار کی چونچ سے وہ چوگ چگانے والے

★

بھٹکی وفاؤں کا ہے نذرانہ زندگی
شمع ہے زلفِ برہم پروانہ زندگی!

ٹوٹا ہے رُوح و جسم کا بندھن فراق میں
اب لے کے کیا کرے گا دیوانہ زندگی

مجُھ پہ سکُوت دیکھ کے ساقی تڑپ اُٹھے
اِک جام میری لحد سے ٹکرانا زندگی

اک پھُول جو شباب کی ٹہنی سی گر پڑا
انجام پوچھتے ہیں سمجھانا زندگی

صحرا کی ریت اور یہ قطرے رگِ شکیں
مانگیں نشان کرب تو دِکھلانا زندگی

لُٹے دِلوں کے ہزاروں شکوے جفا کی بھٹی میں جل چُکے ہیں
مچلتے اَرماں بے تاب ہو کر چھپے خزینے اُگل چُکے ہیں
کہاں گئیں وہ اَدائیں چنچل کہاں چھپے وہ گلاب چہرے
کہا تھا تم سے یہ رُوپ رنگت بھی ڈھلتے سائے ہیں ڈھل چکے ہیں

نگارِ شام جو شعلے اٹھائے جاتے ہیں
انہی کی اوٹ میں زنداں سجائے جاتے ہیں

وہیں وہیں سے اُمنگوں کی گرد اٹھتی ہے
جہاں جہاں مرے آنسو گرائے جاتے ہیں

کڑکتی دھوپ میں تشنہ کھڑے ترستے ہیں
وہ جن کی لاش پہ سفینے جلائے جاتے ہیں

کسی کے لب پہ کوئی داستاں مچلتی ہے
وہ اپنے ناز میں گُم ہیں لجائے جاتے ہیں

بروگِ ابر کئی وادیاں سُلگتی ہیں!
بیادِ کرب سماں بھی لگائے جاتے ہیں

شکیں آگ کی گرمی سے لَو بچھڑتے ہیں
ہوا کے دوش جو چہرے بنائے جاتے ہیں

تیرا در چھوڑ چکے لوگ دِوانے کب سے
اب تو بھولے جو دریچے تھے سُہانے کب سے

دِل کے کٹتے ہوئے ٹکڑوں کی نہ حالت دیکھو
یُوں تو ہوں زہر کا عادی پر نہ جانے کب سے

تنِ مجروح پہ اب کوئی سِتم کوئی نہیں
دَرد بھی چھوڑ چکے اپنے ٹھکانے کب سے

رُوٹھ بیٹھی ہے گلابوں سے یہ گھائل بُلبل
نِکھرے گلشن سے گئے سوز ترانے کب سے

یہ بھی اعجاز جفاؤں کا ہے اے جانِ شکیلؔ
تیرے ہمراز ہیں دُنیا کے بہانے کب سے

ہر رنگِ نزاکت کی گھٹا سامنے پائی
ہے عارضِ جاناں یا بناوٹ کی لچک سے
ساون کی مسافت میں مرا زادِ سفر ہیں!
وہ دَرد جو امڈے تھے خزاؤں کی کسک سے

★

تشنہ بستی پہ ابھی ابرِ کرم چھائے ہیں
کیا یہ موتی بھی کسی آنکھ نے برسائے ہیں

ایک مدہوشی سی چھائی ہے بھری محفل پر،
گیسو اس شوخ نے پھر کھول کے لہرائے ہیں

کیوں نہ اِترائے مری آس کا کچّا مسکن!
آج کٹیا میں مری اُن کے قدم آئے ہیں

تازگی بن کے جو اُترے ہیں گلابی چہرے
کئی پھولوں کے مقدّر میں خزاں لائے ہیں

ہیں اندھیروں سے گریزاں انہیں تبلاؤ شکیلؔ
چڑھتے سورج کا بھی انجام یہی سائے ہیں

لپٹی پاؤں سے مرے آہنی زنجیر نہیں
آدمی خاک سہی راندۂ تقدیر نہیں

مطربو آنکھ ملاؤ کوئی نغمہ چھیڑو
کیوں مرے دل کو لبھاتی کوئی تدبیر نہیں

دل کی روداد وہ اپنی ہی زبانی کہہ دیں!
بہتے اشکوں میں بھلا اتنی بھی تاثیر نہیں

کیوں حسیں نقش بناتا ہوں مٹا دیتا ہوں
ہے بسی دل میں جو بنتی وہی تصویر نہیں

کیف مے نوشی کا ٹوٹا ہے کبھی اے رندو
جو نہ بدلے کبھی ایسی کوئی تقدیر نہیں

دل کی آواز کبھی لہر کے سنگ گونجے گی
مَن میں اک شور لیے نہر کے سنگ گونجے گی

کہکشاں میں کبھی نغمات کبھی آہوں میں،
اور ساجن کے حسیں شہر کے سنگ گونجے گی

جو تڑپتا ہے تیری آس تیری حسرت میں
اس کی اک چیخ ترے زہر کے سنگ گونجے گی

جس کو ظُلمات نے کچلا ہے حسیں دھوکے میں
وہی خاموش صدا قہر کے سنگ گونجے گی!

مری فریاد سنیں گے وہ شکیلؔ اس دن ہی!
درد کی صوت جب اس دہر کے سنگ گونجے گی

خود فریبی کے مہکتے ہوئے گلزاروں میں

ہیں بنے تاج محل جھوٹ کی آشاؤں سے!

کتنا بہلایا مجھے میرے ہی ہاتھوں نے شکیلؔ

اب تو مانگوں گا تجھے اپنی ہی ریکھاؤں سے

کچھ آپ بھی سُن لیتے کچھ ہم بھی سنبھل جاتے
یہ بوجھ تھا زخموں کا دیوانے بہل جاتے

کب دیکھے پتنگے نے شمع کے چند آنسو بھی
اِک بار تو فرماتے پروانے ہیں جل جاتے

تھراتے جو پیاسے لب اظہارِ تمنّا کو
ارماں مرے سینے کے ہونٹوں پہ مچل جاتے

آنکھوں کے سمندر میں رقصاں کئی طوفاں تھے
اک لہر گرا دیتا سرکار دہل جاتے

دو بول شکیلؔ آخر مرہم کا اثر رکھتے،
جو آپ نے بخشے ہیں وہ زخم سہل جاتے

ہم جلتے ہوئے دل والوں کو تم شام ڈھلے یاد آتے ہو
کچھ یادِ غمِ دوراں کی ہے کچھ ہجر میں تم تڑپاتے ہو

میری حسرت کے کچھ افسانے کوہسار بھی سُن کے رام ہوئے
ہم رو رو حال سُناتے ہیں تم جانے کہاں کھو جاتے ہو

تسلیم کہ حُسن کی زینت ہیں یہ شرم یہ آنچل یہ چلمن
اپنوں سے مگر شرمانا کیا اپنوں سے کیوں شرماتے ہو

سنسان نگر میں کون پھرے کیوں ویرانوں میں پھول کھلیں
تربت ہے میری ویراں ویراں تم وحشت سے گھبراتے ہو

کیوں سنگ بدست شکیل آ کر دیتے ہیں تسلی پھر مجھ کو،
پونچھو نہ مرے رُخ سے آنسو معلوم ہے تم بہلاتے ہو

راہ کچھ ایسی بنی پیار کے میخانے سے
اِک تصویر کو ڈھونڈوں تیرے پیمانے سے

شوقِ رندانہ میں جب کھو کے وہ ساغر جھُومے
پھر وہی لہر اٹھی جام کے ٹکرانے سے

سنگ کچھُ تو بھی اٹھالے کہ کوئی یوُں نہ کہے
ایک سنگدل کی شناسائی ہے دیوانے سے

ساعتِ مرگ تلک ہم سے خفا تھے ایسے
شمع ناراض ہو جلتے ہوُئے پروانے سے

ہم کبھی اُن کے تصوّر سے بہل جاتے تھے
اب حقائق بھی نظر آتے ہیں افسانے سے

کتنی اُمید سے یہ درد چلے آتے ہیں
غم کا سامان لیے میرے دریچے کی طرف
شام ہوتے ہی ویرانی کیوں سمٹ آتی ہے
ایک پیمان لیے میرے دریچے کی طرف

☆

چھائی خزاں چمن پر یہ لطف کتنا کم ہے
افسردگی گلوں پر کس بات کا یہ غم ہے

اس شہر کے جہاں کی بُنیاد آتشیں ہے
اک آنچ ہی ملی ہے کیوں آنکھ اتنی نم ہے

جس کی فضا میں غم کی تنہائیاں چھپی ہوں
اس قید کو بھلا دے طائر میں کب یہ دم ہے

دیوانگی کی لذت دیوانگی سے پوچھو!
اک مست خود بخود ہے اور موج کا بھرم ہے

پوچھو نہ کچھ شکیلؔ کہ کیسی گذر رہی ہے
قسمت کے ہیں کچوکے اور وقت کا کرم ہے

یوں ٹوٹ کے برسے ہیں کسی قہر کے بادل
ہر چیز کی وحشت سے چھلکتے ہیں فسانے
کس تار سے یہ درد کی لے گونج رہی ہے
کس ساز کی لرزش پہ یوں رقصاں ہیں دوانے

